اہلِ قلم واہلِ سیف، ہمہ صفت موصوف۔ میجر (ر) ڈاکٹر محمد خاں اشرف کے علمی اور ادبی کارنامے

ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف

Dr. A.B. Ashraf

Ankara, Turkey.

Abstract:

Major (R) Dr. Muhammad Khan Ashraf is multidimensional personality. He has a soldier, an Army Officer, an Educationist and a Scholar. He is a Poet, Researcher, Cr4itic and a University teacher, now serving as a professor of Urdu at LGU Lahore.

It is difficult to discuss the diverse qualities in one paper. However Dr. A.B. Ashraf of Ankara, Turkey has done this difficult job. He has reviewed the personality and performance of Major (R) Dr. Muhammad Khan Ashraf in all sphere of his activities and presented us with a complete picture / profile of the man, thinker, poet and educationist.

میجر (ر) ڈاکٹر محمد خاں اشرف اردو ادبیات کی ایک ایسی مختلف الحیثیات شخصیت کے مالک ہیں کہ جن کی مثال افواجِ پاکستان سے تعلق رکھنے والی ادبی شخصیتوں میں کہیں اور نہیں ملتی۔ بے شک افواجِ پاکستان کے مختلف شعبہ جات سے متعلق بیسیوں بلکہ سینکڑوں ادبا اور شعرا ایسے تھے اور ہیں جن کو اردو شعر و ادب میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوا۔ پوری تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ میں یہاں محض چند ایک نمایاں شخصیتوں کا نام لوں گا۔ مثلاً سب سے پہلے کرنل فیض احمد فیض دکھائی دیتے ہیں جو بحیثیت شاعر بلند ترین مرتبے پر فائز ہوئے۔ تنقید اور تہذیب و ثقافت کے ضمن میں بھی اُن کی دو ایک کتابیں موجود ہیں لیکن ان کی پہچان بیسویں صدی کے ایک نامور اور عظیم شاعر کے بطور ہوئی۔ اسی زمانے میں چراغ حسن حسرت بطور صحافی اور کالم نگار مشہور ہوئے۔ جنرل شفیق الرحمٰن ایک مزاح نگار کی حیثیت سے معروف ہوئے تو جعفر طاہر ایک شاعر کے طور پر۔ اسی طرح بریگیڈیئر صدیق سالک ایک وقائع نگار (میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا) کی حیثیت سے مانے گئے تو کرنل محمد خاں مزاح و ظرافت کے میدان کے شہسوار تسلیم کیے گئے۔ میجر ضمیر جعفری کی پہچان ایک مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے ہوئی۔ گویا افواجِ پاکستان سے تعلق رکھنے والی ان تمام شخصیتوں نے کسی ایک ہی صنفِ ادب میں ایسا نام پیدا کیا کہ ان کو ''شہرت عام بقائے دوام'' میں جگہ ملی مگر ڈاکٹر محمد خاں اشرف بیک وقت ایک مفکر شاعر، ایک نظریہ ساز نقاد، ایک جُزرس محقق و مدون، قومی سلامتی اور عسکری نوعیت

کی کتابوں کے مصنف، ایک منفرد اسلوب نگار، نہایت اعلیٰ درجے کے مترجم اور شارح، ایک مستند لغت نگار، ایک تجربہ کار ماہرِ تعلیم، دانشور قلم کار اور جینوئن تخلیق کار ہیں۔ ایسی متنوع نوعیت کی تخلیقی اور ادبی صلاحیتیں یکجا طور پر کسی کے ہاں نادر ہی دکھائی دیں گی۔ (البتہ بریگیڈیئر حامد سعید اختر ایک ایسے ریٹائرڈ عسکری ادیب ہیں جن سے میرا تعارف ماہنامہ ''الحمرا'' کے حوالے سے ہوا۔ ان کے الحمرا میں چھپنے والے مضامین، افسانے، غالب کی شرحیں، خاکے اور وقائع میں نے پڑھے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی مختلف اصنافِ ادب پر قلم کاری کرتے ہیں۔ میری بدقسمتی کہ میں ابھی تک ان کی کسی تصنیف تک رسائی حاصل نہیں کر سکا)۔

ادبیات میں ان کو شغف اس زمانے سے ہے جب وہ پچھلی صدی کی چھٹی دہائی میں ایم۔اے اردو کے طالب علم تھے۔ اس زمانے ہی سے انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اُس دور میں ''ٹیڈی ازم'' کی وبا پوری دنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پاکستان کے نوجوانوں میں بھی یہ فیشن بہت مقبول ہوا۔ محمد خاں اشرف نے اس موضوع پر ایک طبع زاد کتاب ''لباس کا مسئلہ'' کے عنوان سے لکھ ڈالی، جو اس وقت کے مشہور ادارے ''مکتبہ میری لائبریری لاہور'' سے ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ اس سے اگلے سال یعنی ۱۹۶۴ء میں اسی ادارے سے اردو کے پہلے باقاعدہ غزل گو شاعر ولی دکنی پر ان کی مرتب کردہ کتاب ''ولی۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مختلف محققوں اور نقادوں کے لکھے ہوئے ولی پر مختلف موضوعات پر مبنی مقالات شامل تھے۔ یہ کتاب ایم۔اے اردو کے طالب علموں کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی اور اسے کئی یونیورسٹیوں نے ریفرنس بک کے طور پر شاملِ نصاب کیا۔ میری لائبریری کے علاوہ دوسرے اداروں نے بھی اس کو شائع کیا اور اس طرح اس کتاب کے کئی ایڈیشن سامنے آئے۔ ۱۹۶۴ء ہی میں محمد خاں اشرف نے ولی کا دیوان کا انتخاب بھی مرتب کر ڈالا جو مکتبہ میری لائبریری سے اشاعت پذیر ہوا۔

پبلک سروس کمیشن سے بطور لیکچرار منتخب ہوئے تو ''گورونانک میموریل کالج ننکانہ صاحب'' میں ان کی تعیناتی ہوئی جہاں ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۷ء تک تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس دور میں ان کی دو مرتب کردہ کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک ''فسانۂ مبتلا از نذیر احمد۔ ترتیب و مقدمہ'' اور دوسری ''خیالستان از یلدرم۔ ترتیب و مقدمہ''۔ یہ دونوں کتابیں بھی مکتبہ میری لائبریری سے بالترتیب ۱۹۶۶ء اور ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئیں۔

پھر اچانک اُن کے جی میں کیا آئی کہ قلم چھوڑ تلوار ہاتھ میں پکڑ لی۔ فوجی تربیت کی تکمیل پر ''شمشیرِ توقیر'' (Sword of Honour) حاصل کی اور پورے بیس (۲۰) سال (۱۹۶۷ء۔۱۹۸۷ء) تک فوجی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں وہ کارنامے انجام دیے کہ ''ستارۂ حرب''، ''ستارۂ جنگ'' اور ''ستارۂ جرأت'' حاصل کیے۔

۱۹۸۷ء میں فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۴ء تک گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں پھر تدریس کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۵ء سے ۲۰۱۲ء تک گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر اور وزٹنگ پروفیسر کے خدمات انجام دینے کے بعد لاہور گیریژن یونیورسٹی میں بطور پروفیسر وابستہ ہوئے اور ابھی تک اس یونیورسٹی کو ان کی خدمات حاصل ہیں۔

فوج سے علیحدگی کے بعد انھوں نے ۱۹۹۱ء میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی سے اردو تنقید کے رومانوی دبستان پر پی

ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ان کی تصنیفات وتالیفات کی تعداد تینتیس (۳۳) تک پہنچ چکی ہے اورابھی کئی کتابیں زیرِ طبع ہیں۔

اس مختصر سے شخصی تعارف کے بعداب میں اُن کی ادبی شخصیت کا جائزہ بطور شاعر،نقاد،محقق اور قلم کار لیتا ہوں۔

بطور شاعر

جن دنوں (۱۹۶۱ء۔۱۹۶۳ء) مَیں اور محمد خاں اشرف پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں ایم۔اے اردو کی جماعت میں زیرِ تعلیم تھے تو ان میں شعروشاعری کی علامات بالکل موجود نہ تھیں بلکہ ان کی زبانی کوئی شعر سننے کی بھی حسرت ہی رہی۔ کہنے کا مطلب یہ کہ انھیں شعروشاعری سے کوئی زیادہ رغبت نہیں تھی مگر جب پوسٹ ماڈرن دور میں یکے بعد دیگرے ان کے مجموعہ ہائے کلام آنا شروع ہوئے تو اس بات کا یقین ہوا کہ ضروری نہیں ہر شاعر پیدائشی طور پر شاعر ہو بلکہ حالی کے نظریے کے مطابق مطالعے،عشق اور تجربے سے بھی شاعر بنا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی میں الہام اور تخلیق کی وہبی صلاحیتیں موجود تو ہوں مگر اظہار کا موقع نہ ملا ہو یا طبیعت مائل ہی نہ ہوئی ہو۔ بہرحال ڈاکٹر اشرف کے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انھیں مخصوص حالات اور قومی سانحات نے شاعر بنایا۔ اگر وہ سقوط ڈھاکہ کے بعد کیمپ ۹۹ میں جنگی قیدی نہ بنتے تو شاید شاعری کی دیوی اُن پر عاشق نہ ہوتی۔ اپنے پیاروں سے دوری اور مہجوری نے اُن کے دردمند دل کو اس قدر گداز کیا کہ وہ اپنے جذبات واحساسات کو شعر کا روپ دیے بغیر نہ رہ سکے۔ قید کے دوران فرصت اور فرقت کے لمحات میں انھوں نے اپنے جذبوں کو زبان دی اور طبع آزمائی کر کے باقاعدہ شاعر بن گئے۔

ان کا پہلا مجموعہ ''درد کا سورج'' سامنے آیا جس کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پھر غزلوں کا ایک مجموعہ ''مداوا'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا تو ان کی شاعرانہ اور تخلیقی صلاحیتیں پایۂ ثبوت کو پہنچیں۔ اب گویا شاعری کی دیوی ان پر پوری طرح مہربان ہو چکی تو ''شاخِ آہو'' کے عنوان سے ان کی نظموں کا مجموعہ پڑھنے کو ملا۔

ان کے تینوں مجموعہ ہائے اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں محبت کا حوالہ ہی سب سے بڑا حوالہ ہے۔ ظاہر ہے یہ موضوع نہ تو کبھی پرانا ہوا اور نہ کبھی رفت وگزشت ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری ہی نہیں دنیا کی ہر زبان کی شاعری محبت ہی کے مدار پر گھومتی ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہہ دوں کہ دنیا اور کائنات کا سارا نظام ہی محبت (سائنس کی زبان میں اسے کشش سمجھ لیجیے) پر قائم ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر یہ جذبہ مفقود ہو جائے تو دنیا ہی باقی نہ رہے۔ محمد خاں اشرف کی شاعری محبت کے جذبے سے مملو ہے۔

ان کی شاعری کی دوسری خوبی جذبہ وفکر کا حسین امتزاج ہے۔ وہ آدھے فلسفی اور آدھے شاعر کی خوبیوں سے مزین ہو کر مکمل شاعر بنے ہیں کیونکہ میتھیو آرنلڈ کے مطابق آدھا شاعر آدھا فلسفی ہی مکمل شاعر ہوتا ہے۔ پھر اُن کے کلام میں معاشرتی حوالوں (سیاسی نہیں) کے ساتھ ساتھ وقت، زمان ومکاں، طبعیات اور مابعد الطبعیات کے مسائل ومعاملات بھی موضوع بنے ہیں جو سوچ اور فکر کو مہمیز دیتے ہیں۔ میں محض ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان کے اب تک کے آخری مجموعے ''شاخِ آہو'' کی ابتدا ''حمد'' سے ہوتی ہے۔ حمدیں اور نعتیں اللہ اور رسولؐ سے محبت اور عقیدت کا مظہر ہوتی ہیں۔ ان میں کائنات کے سائنسی نظریات پیش کرنے کی گنجائش کم ہی ہوتی ہے۔ محمد خاں اشرف نے اپنی حمد کے پہلے بند میں کائنات کے ہیبت ناک پہلو کی طرف

اشارہ کیا ہے جس کو پڑھ کر قاری کا ذہن خود بخود کہکشاؤں کے لامتناہی سلسلوں اور ان کے درمیانی راستوں اور سرنگوں میں سے گزرنے کے بعد بلیک ہول کے سلسلوں کی طرف مبذول ہو جاتا ہے جو مختلف مردہ اور بجھے ہوئے سیاروں کے جھرمٹوں کی ٹوٹ پھوٹ کو مجتمع اور جذب کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نگل لیتے ہیں (یعنی قاری کا رہوارِ خیال سٹیفن ڈبلیو ہاکنگ کے نظریہ بلیک ہول کی طرف منعطف ہو جاتا ہے) وہ بند یہ ہے:

ازل ایک موہوم دھندلا ہیولا
ابد ایک صحرائے ناپیدو نارس
جہاں کتنی صدیوں، زمانوں کے قرنوں کے
لاانتہا بے کراں سلسلے
کھو چکے ہیں
جہاں کہکشاؤں، اندھیرے محیطوں کے
بے حد و لامنتہا فاصلے
گم پڑے ہیں
ہویدا بھی ناپید بھی
ہو چکے ہیں
۔۔۔۔ہوتے رہیں گے

گویا اس بند میں خدائے ذوالجلال کا جلالی پہلو سامنے آتا ہے تو ایک اور بند میں فطرت کا رومانوی رنگ قاری کو ریلیف یعنی سکون کا احساس عطا کرتا ہے۔اور ظاہر ہے یہ خدا کا جمالی پہلو ہے۔

تو اے خالقِ لامکان و مکان و زماں
کہ ہر شے ہے تیرے ارادے سے ظاہر
یہ صبحِ درخشاں کا روشن اجالا
دریچے سے باہر یہ گاتے پرندے
ہر اک سمت بکھری صدائے خموشی
سرِ برگِ گُل ایک شبنم کا قطرہ
سرِراہ گزرا ایک نوخیز لڑکی
کہ بھیڑوں کا ریوڑ لیے جارہی ہے

اس طرح کے سائنسی اور فکری حوالے اور ان کے ساتھ فطرت کے رومانوی پہلوؤں کی عکاسی اُن کی شاعری میں جا بجا دکھائی دیتی ہے۔دراصل وہ غالب اور اقبال سے بے حد متاثر ہیں اور انھی کی طرح اپنی شاعری میں محبت کے ساتھ ساتھ فلسفہ و فکر، مابعد الطبیعات، تصوف کے مسائل و معاملات کو بڑے تواتر اور شیفتگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔مختصر یہ کہ ڈاکٹر اشرف نے

دنیا، کائنات اور خالقِ کائنات کے بارے میں، زمان و مکاں اور دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں، زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بارے میں، خوشیوں اور غموں کے بارے میں، موسموں اور رنگوں کے بارے میں، حسن وعشق کے بارے میں، انسانی جذبوں کی رنگارنگی اور تنوع کے بارے میں اپنے خیالات واحساسات کا اظہار اپنی خوبصورت شاعری میں کیا ہے۔ البتہ اُن کے یہاں سیاسی حوالے بالکل نہیں ہیں کیونکہ وہ سیاسی آدمی ہیں ہی نہیں۔

بطور محقق اور نقاد

میرے خیال میں تحقیق وتنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تحقیق میں تنقید کا عنصر اور تنقید میں تحقیق کا پہلو ناگزیر ہے۔ تحقیق کے بغیر نہ اچھی تنقید وجود میں آسکتی ہے اور نہ تنقید کے بغیر اچھی تحقیق کا وجود ممکن ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد خان اشرف بیک وقت ایک جُزرس محقق و مدوِن بھی ہیں اور ایک نظریہ ساز نقاد بھی۔ اُن کے یہاں تحقیق وتنقید کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ اُن کی تحقیقی اور تنقیدی کتابوں میں ''اردو تنقید کا رومانوی دبستان'' (مطبوعہ اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۹۸ء)، ''رومانویت اور اردو میں رومانوی تحریک'' (الوقار پبلی کیشنز لاہور ۱۹۹۸ء، اور سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۲ء)، ''اردو ادب۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ مضامین'' (الوقار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء) اور ''ادب کیا ہے؟ ادب کا ایک مربوط نظریہ'' ادارۂ زبان وثقافت لاہور ۲۰۱۸ء) جیسی طبع زاد کتابیں شامل ہیں جبکہ مرتبہ کتابوں میں ''ولی۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' (مکتبہ میری لائبریری لاہور ۱۹۶۴ء، اعجاز پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۳ء اور القمر پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۱ء سے چار ایڈیشن چائع ہوئے۔

اردو کی رومانوی تنقید پر ڈاکٹر محمد حسن کا ایک کتابچہ، ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کی تحریکیں میں ایک آدھ باب، اور کچھ مضامین ملتے ہیں جو ڈاکٹر اشرف کی کتاب سے پہلے موجود تھے۔ ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے اس موضوع پر تحقیق کر کے بہاءالدین زکریا یونیورسٹی سے ۱۹۹۱ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر اس مقالے میں توسیع واضافہ کر کے اسے کتابی صورت میں شائع کرایا جس کے دو ایڈیشن منظرِ عام پر آئے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رومانوی دبستانِ تنقید پر ڈاکٹر اشرف اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی اس کتاب کو حاکمیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے مختلف زبانوں اور خصوصاً انگریزی کی سینکڑوں کتابیں اور مقالات پڑھ ڈالے۔ اس کتاب کے بارے میں تفصیلی رائے دینے کی اس مقالے میں گنجائش نہیں ہے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

تنقید میں ان کی دوسری اور جنّل کتاب ''ادب کیا ہے؟ ادب کا ایک مربوط نظریہ'' ہے۔ اردو میں نظریاتی تنقید کے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جس کو اردو تنقید کی ایک نئی بوطیقا قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے نظریاتی تنقید پر اس نوعیت کی کوئی طبع زاد کتاب موجود نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارا نظریاتی تنقید کا سارا سرمایہ ''مقدمہ شعروشاعری'' تک محدود تھا اور سب کو معلوم ہے کہ یہ مقدمہ محض شعروشاعری کے موضوع پر مبنی ہے اور حالی کے دیوان کا دیباچہ یا مقدمہ ہے جس کو الگ کر کے کتاب کی صورت دے دی گئی۔ پھر اس میں زیادہ تر مغربی شاعروں اور نقادوں کے خیالات کو مکمل طور پر سمجھے بغیر محض ترجمہ کر کے پیش کر دیا گیا اور بعض جگہوں پر تو ترجمہ بھی درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں اشرف کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں ادب کے تمام عناصر اور اجزا کا بڑی جامعیت اور تفصیل کے ساتھ احاطہ کیا ہے اور اردو میں نظریاتی تنقید کی کمی کو پورا کیا ہے۔ اس کتاب میں ادب کیا ہے؟ ادب کا ایک مربوط

نظریہ، ادبی مظہر کے اجزائے ترکیبی، تخلیقی تجربہ، ادب پارہ، زبان۔ ادب پارہ کا اظہاری وجود، ادب اور معاشرہ، ادب میں قاری کا کردار، نقاد اور تنقید کا منصب جیسے مباحث شامل ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بلاشبہ اردو کی نظریاتی تنقید میں اولین سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

تحقیق و تنقید میں ڈاکٹر محمد خاں اشرف کا ایک اور بڑا کارنامہ ''کلیاتِ غالب۔ نسخہ اشرف'' کی تدوین ہے جس کو بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کے شاہکار (Mignum opus) کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ اس کلیات کو مرتب و مدون کرنے میں ڈاکٹر صاحب نے زندگی کے پچاس برس صَرف کیے ہیں اور ایک ایسا منفرد کلیات مرتب کیا ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس سے پیشتر شائع شدہ تمام مجموعوں اور دیوانوں سے مختلف، ممتاز اور نمایاں ہے۔ اس کلیات کی انفرادیت یہ ہے کہ اس سے پہلے شائع شدہ جملہ مجموعوں میں سے ہر ایک میں اشعار کی کُل تعداد ۱۸۰۲ سے زیادہ نہیں جب کہ ڈاکٹر صاحب کے مرتب کردہ کلیات میں اشعار کی تعداد ۴۳۸۷ ہے۔ گویا غالب کے نصف سے زیادہ متروک اور خارج کردہ کلام کو انھوں نے اپنے اس کلیات میں شامل کیا ہے۔ اس طرح غالب جیسے نابغہ اور عظیم شاعر کا جملہ کلام پہلی مرتبہ یکجا ہو کر کلیات کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ گویا اردو ادب کے اولیات میں ڈاکٹر محمد خاں اشرف کی کتاب ''ادب کیا ہے؟'' کے علاوہ ان کا ''کلیاتِ غالب۔ نسخۂ اشرف'' بھی شامل ہے جس کو سنگ میل پبلی کیشنز نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کلیات کو الف بائی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ غالب کے ہر دیوان میں پہلی غزل وہ ہے جس کا پہلا مصرعہ ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا'' ہے۔ مگر ''کلیاتِ غالب۔ نسخۂ اشرف'' میں یہ غزل پانچویں نمبر پر ہے یعنی الف بائی ترتیب سے اس غزل سے پہلے چار غزلیں موجود ہیں۔ پھر اس کلیات کے ساتھ فرہنگ بھی شامل کی گئی ہے جو اشعار کی تفہیم میں بے حد مفید اور ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

اُن کے لکھے ہوئے اردو ادب کے تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بھی انفرادیت کا رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ایک تو ان کے مقالات کے موضوعات منفرد نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وہ لگے بندھے موضوعات نہیں لیتے اور نہ ہی مروجہ لگے بندھے تنقیدی اصولوں کو سامنے رکھ کر ان کا تجزیہ کرتے ہیں بلکہ اور جنل موضوعات منتخب کر کے ان پر اپنی فکر اور طبع زاد تنقیدی نظریات کے مطابق اُن کا جائزہ لیتے اور باقاعدہ منطقی نتائج استنباط کرتے ہیں۔ ان مضامین کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تنقید و تحقیق کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جس سے ان کے مضامین کے مندرجات مدلّل بھی بنتے ہیں اور ان کے متوازن تنقیدی نظریات کا اثبات بھی کرتے ہیں۔ ان کی تنقید، رومانوی، نفسیاتی، سماجی اور ترقی پسند تنقیدی نظریات کا مرکب ہے۔

بحیثیت مکتوب نگار

شاعری کے علاوہ جس صنف میں ڈاکٹر محمد خاں اشرف کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہوئی ہیں وہ ان کے مکاتیب ہیں۔ اُن کے یہ خطوط جو شہناز کے نام ہیں، پہلی بار ۲۰۰۷ء میں مکتبہ الوقار سے شائع ہوئے اور پھر ۲۰۱۴ء میں ملک کے مشہور اشاعتی ادارے سنگ میل پبلی کیشنز سے شائع ہوئے اور ''شہناز کے نام'' کا یہی ایڈیشن میرے سامنے ہے۔

شہناز کے نام یہ خطوط محمد خاں اشرف نے اپریل ۱۹۶۷ء سے اکتوبر ۱۹۶۷ء تک کے درمیان لکھنے شروع کیے، جب وہ کاکول ملٹری اکیڈمی میں ٹریننگ حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر اٹھارہ سال کے وقفے کے بعد

۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۷ء تک یہ سلسلہ پھر جُڑ گیا۔

سب جانتے ہیں کہ مکاتیب کو ادب کا درجہ دینے کا سہرا غالب کے سر جاتا ہے۔اُن کے شخصی اور ذاتی نوعیت کے خطوط اردو کے نثری ادب کا سرمایہ ہیں ۔ یہ خطوط غالب کی نجی زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے زمانے کے سیاسی ، سماجی ، اقتصادی اور تاریخی احوال کی ایک سچی تصویر پیش کرتے ہیں ۔ پھر سرسید، شبلی ، آزاد، اختر ، اقبال اور نہ جانے کن کن بڑی شخصیتوں کے خطوط بھی شائع ہو چکے ہیں جو ہمارے تخلیقی ادب کا حصہ ہیں ۔ڈاکٹر محمد خاں اشرف کے مکاتیب بھی تخلیقی ادب کے زُمرے میں آتے ہیں ۔اپنے اس مجموعۂ مکتوبات کے انتساب میں انھوں نے خطوں کے لکھنے کا جواز یہ پیش کیا ہے:

کچھ ایسے لوگ ہیں دنیا میں
کہ جن سے آپ مخاطب ہوں
تو دل کو ایک سکون ملے

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں
کہ جن سے آپ کریں باتیں
تو جینے کا عرفان ملے

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں
کہ جن کی گود میں سر رکھ کر
ہم سارے دکھ رو لیتے ہیں

اے میرے دوست
میں خوش ہوں کہ
یہ ساری باتیں تجھ میں ہیں

(''شہناز کے نام''ص ۷)

گویا جس دوست میں انھیں یہ ساری باتیں نظر آئیں وہ خوش قسمت شہناز ہیں ۔شبلی اور اقبال نے عطیہ فیضی کے نام خطوں میں اپنی جذباتی کیفیتوں کا اظہار برملا کیا۔اختر نے تو اپنی رومانویت کا پورا رنگ اپنے خطوں میں بھر دیا۔محمد خاں اشرف نے اپنے خطوں میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے ۔ میں نے یہ سارے خط پڑھے ہیں ،کہیں ایک جگہ بھی مجھے ان منیں جذباتیت ، سطحیت یا ماربڈ (Morbid) رومانویت کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ اگر ایسا ہوتا تو شہناز ان کو کبھی شائع نہ کراتیں ۔شہناز نے خود یہ سارے خطوط ڈاکٹر صاحب کی لائق فائق شاگردہ ڈاکٹر عظمت رباب کو چھپوانے کے لیے دیے اور ان خطوط کی اپنی زندگی میں اہمیت کا اعتراف بھی کیا:

''سب سے پہلے یہ خط ۱۹۶۷ء میں لکھے گئے تھے جب میں ایک طالبہ تھی اور آخری ۱۹۸۷ء میں جب زندگی کے سمندر کی موجوں کی زد میں تھی۔ زندگی کے اس سفر میں یہ ہمیشہ مجھے امن وسکون اور خلوص کے جزیرے محسوس ہوئے۔ اس طویل سفر میں جہاں بہت کچھ موہوم اور گم ہو چکا ہے۔ یہ اب بھی اسی طرح سرسبز محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے ان میں ہمیشہ ایک پر خلوص، بے لوث اور دانا، جرأت مند شخصیت کی جھلکیاں دکھائی دیں جنھوں نے مجھے ہر طرح کے حالات میں زندہ رہنے کا حوصلہ دیا۔'' (شہناز کے نام،ص ۹)

خطوط کے اس مجموعے پر اس کی مرتب ڈاکٹر عظمت رباب اور یونیورسٹی میں ان کی رفیقۂ کار ڈاکٹر شازیہ رزاق نے بہترین تبصرے کیے ہیں اور بڑی تفصیل سے ان خطوط کی انفرادیت اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: ''شہناز کے نام،ص ۱۶۹۔۹۱۹۸

مختصر یہ کہ ان خطوط میں ڈاکٹر اشرف کی فوجی زندگی کے لمحات وواقعات، کائنات اور دنیا کے بدلتے رنگوں کے بارے میں ان کے تاثرات، معاشرتی اور سماجی رویوں کی بوالعجبیوں، انسانی نفسیات کی بوقلمونی، فطرت کے مناظر اور ان کے جلال و جمال کے انسانی جذبات واحساسات پر اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اکابرین کے خطوط سے یہ مکاتیب اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں فطرت کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ اس کی تباہ کاری اور قہاری کے پہلو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ان خطوں میں محمد خاں اشرف کے فلسفیانہ افکار بھی جگہ جگہ پڑھنے کو ملتے ہیں۔

بطور مترجم

ڈاکٹر محمد خاں اشرف اپنی بے مثال تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ترجمے کی بھرپور اور اعلیٰ درجے کی صلاحیت کے مالک بھی ہیں۔ انھوں نے بے شمار تراجم کیے ہیں جن میں ارونگ لوئی کی ''ٹالسٹائی اور گاندھی۔ امن کا خواب''، ڈیرک والکوٹ کے ''نوبیل لیکچر''، ''شہرآشوب''، ''ایک سلطنت کے زوال پر دو نظمیں'' اور کئی دیگر تخلیقات کے تراجم، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ''شطرنج کی بازی'' اور ''ویرانہ'' کے نام سے ان کی عالمی شہرت یافتہ نظم "The Waste Land" کا منظوم ترجمہ قابلِ ذکر ہیں۔ میرے خیال میں ان سارے معیاری تراجم میں ''ویرانہ'' (جو کتابی شکل میں بھی چھپ چکی ہے) ان کا شہکار ہے اور میں ''مشتی نمونہ از خرواری'' کے مصداق اسی ترجمے پر ایک اجمالی نظر ڈالوں گا۔

ظاہر ہے ''ویرانہ'' ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شہرہ آفاق نظم (The Waste Land) کا منظوم ترجمہ ہے جسے پاکستان کے عظیم اشاعتی ادارے ''سنگِ میل پبلی کیشنز'' نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا۔ سب کے علم میں ہے کہ "The Waste Land" ایلیٹ کی وہ طویل نظم ہے جسے بیسویں صدی کی بہترین نظم تصور کیا جاتا ہے۔ اور یہ دورِ جدید کے کلاسیک میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم کا بیک گراؤنڈ ''جنگِ عظیم اول'' کا پیش منظر ہے یعنی جنگ کے بعد کی تباہی و بربادی، دہشت گردی، زوال وانتشار، مایوسی اور بے یقینی، زندگی کی بے ثباتی، قدیم وجدید کی آویزش۔ گویا پوری دنیا کی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت کو اس نظم کے کینوس میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم گویا جنگ کے بعد کے زمانے کی ایک المیہ داستان ہے جس کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اساطیری، تہذیبی اور ثقافتی اشارے کنائے، علامتیں اور تمثالیں، ثقیل اور نامانوس الفاظ اور ترکیبیں استعمال کر کے اس کو خاصا ثقیل، مبہم اور ناقابلِ

فہم بنا دیا مگر لطف کی بات یہ ہے کہ دنیا کی تمام یونیورسٹیوں کے انگریزی ادب کے نصابوں میں یہ نظم شامل ہے کیونکہ یہ ایک عظیم تخلیق اور شعری شاہکار ہے۔

اردو میں اس نظم کے بے شمار تراجم ہو چکے ہیں۔ اردو کے نامور ادبا اور علما عزیز احمد، رفیق خاور، انیس ناگی، مبارک احمد کے علاوہ انگریزی کے معروف و مقبول استاد پروفیسر سراج الدین بھی اس نظم کا ترجمہ اردو میں کر چکے ہیں۔ سب کے سب تراجم قابلِ قدر ہیں مگر یہ تراجم ڈاکٹر محمد خاں اشرف کے ترجمے کے معیار کو نہیں پہنچتے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جو ترجمہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کیا ہے وہ بہترین اور بے مثال ہے۔ اس ترجمے کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے کے سارے تراجم نثر میں ہیں جبکہ یہ پہلا اور اب تک آخری ترجمہ ہے جو منظوم ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے لفظ بہ لفظ اور سطر بہ سطر ترجمے کی شکل میں نہ صرف اس نظم کے متن اور مفہوم کی معنویت کو تخلیقی سطح پر محسوس کر کے اس کی روح کو اپنے ترجمے میں سمیٹ لیا ہے بلکہ اس کی ظاہری ہیئت کو بھی بخوبی برقرار رکھا ہے۔ مثلاً نظم کے آغاز ہی میں:

April is the cruelest month, breeding

اپریل ہے ظالم ترین مہینہ، اگائے

Lilacs out of the deadland, mixing

کلیاں مردہ زمین میں سے، ملائے

Memory and desire, stirring

یادوں کو ارمانوں سے، ہلائے

Dull roots with spring rain

مضمحل جڑوں کو بہار کی بارش سے

(ویرانہ، سطر ۱-۴)

Stirring, Mixing, Breeding کو اگائے، ملائے، ہلائے کے نہایت موزوں اور مناسب الفاظ میں ترجمہ کر کے چاروں سطروں (مصرعوں) کو بڑی ہنرمندی اور مہارت سے جوڑ کر بند کو مکمل کیا ہے۔ جو فضا، ماحول، تاثر اور ردم انگریزی میں پیدا ہوا ہے وہی اردو ترجمے میں بھی در آیا ہے۔ میں یہاں مزید بات کرنے کے بجائے صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایلیٹ کی نظم کا ایک بند ہے جس میں جنگ عظیم اول کے نتیجے میں مختلف شہروں کی بربادی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بند یہ ہے:

What is that sound high in the air
Murmur of maternal lamentations
Who are those hooded hordes swarming
Over endless plains, stumbling in cracked earth
Ringed by the flat horizon only

What is the city over the mountains
Cracks and reforms and bursts in the violet air
Falling Towers
Jerusalem Athens Alexandria
Vienna London
Unreal

ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

یہ کیا صدا ہے بلندیوں پر ہوا کے اندر
مامتا ہے جو فریاد کر رہی ہے
نقاب پہنے ہجومِ آوارگاں وہ کیا ہے
وہ سرزمینِ بلانشاں، شکستہ دھرتی میں لڑکھڑاتے
سپاٹ آفاق سے گھرے بس
وہ شہر کیا ہے پہاڑیوں کے جو اس طرف ہے
جو پھٹتا، بنتا ہے ٹوٹ جاتا ہے اپنی اودی ہوا کے اندر
برج ہیں گرتے
یروشلم ہے وہ یا کہ ایتھنز، سکندریہ ہے
وی آنا ہے یا کہ لندن
بے حقیقت

ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے اس بند کو اتنی خوبصورتی سے اردو میں منتقل کیا ہے کہ انگریزی کے اس بند کی روح کو اپنے اندر کشید کر لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مترجم نے پوری نظم کا ترجمہ اتنی مہارت، ہنرمندی اور قابلیت سے کیا ہے کہ اُن کی ترجمہ کردہ نظم بجائے خود ایک طبع زاد تخلیقی تجربہ بن گئی ہے۔ مرحوم انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں (ڈان ۱۵ ستمبر ۲۰۱۳ء) اس ترجمے کی بے حد تعریف کی حتیٰ کہ اس کے عنوان (ویرانہ) کو مندرجہ بالا پانچوں مترجمین کے ترجمہ کردہ عنوانات پر ترجیح دی۔ ڈاکٹر صدیق جاوید مرحوم نے اس ترجمے کی تعریف میں لکھا کہ:

> ’’زیرِ نظر ترجمہ ’’دی ویسٹ لینڈ‘‘ کا پہلا منظوم ترجمہ ہے جو شعری آہنگ، ترتیب اور روانی کی خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ ترجمہ اس بنا پر متنوع خصوصیات کا حامل ہے کہ اس نظم میں متعدد زبانوں کے الفاظ اور کلاسیک یورپی داستانوں اور ہندی روایات موجود ہیں۔ مترجم کی خاصیت یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف نظم کی شعریت اور ہیئت کو برقرار رکھا ہے بلکہ اس فضا کو بھی برقرار رکھا ہے جو شاعر نے تخلیق کی ہے۔‘‘ (ویرانہ، ص ۲۰)

اپنے اسی تعارف میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے ویسٹ لینڈ کا ترجمہ جس اپنائیت، خلوص اور محنت سے کیا ہے اس نے ترجمے کو واقعی تخلیقِ مکرر کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔'' (ص ۲۰،۲۱)

مختصر یہ کہ بطور مترجم بھی ڈاکٹر محمد خاں اشرف اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

عسکری دانشور کی حیثیت سے

جیسا کہ پچھلے صفحات میں لکھ چکا ہوں جناب محمد خاں اشرف فوج میں آنے سے پہلے کالج میں پڑھاتے تھے۔ تدریس کے ساتھ ساتھ لکھنے پڑھنے کا سنجیدہ شغل بھی جاری رکھے ہوئے تھے بلکہ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن کا تذکرہ مضمون کے سابقہ صفحات میں کر چکا ہوں۔

سب کو معلوم ہے کہ فوج میں آفیسر رینک میں بھرتی ہونے کا معیارِ تعلیم انٹر ہے اور عموماً نوجوان انٹر کرنے کے بعد ہی فوج میں بھرتی ہوتے ہیں یہ اور بات کہ بعد میں اُن کو مزید تعلیم وغیرہ دی جاتی ہے مگر کیڈٹ بننے یا رہنے کے زمانے میں ان کا ذہنی افق بڑا محدود ہوتا ہے جبکہ محمد خاں اشرف فوج میں داخلے کے وقت نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے (ایم۔اے) بلکہ بطور ایک مستند قلم کار، سکالر اور دانشور اپنے آپ کو منوا چکے تھے۔ فوج میں بیس (۲۰) سال تک اپنی بہترین خدمات انجام دینے اور کئی ایک کارنامے دکھانے اور اعزازات حاصل کرنے کے بعد انھوں نے پھر سے تعلیم و تدریس کا شعبہ اپنایا اور قلم کاری کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ مختلف اصنافِ ادب میں ان کے رشحاتِ قلم نے رنگ بکھیرے اور اُن کی بے شمار تصنیفات وجود میں آئیں جن کی تفصیل اس مضمون میں مختلف عنوانات کے ذیل میں آ چکی ہے۔

یہاں مجھے اُن کی دو ایسی کتابوں کا ذکر کرنا ہے جو انھوں نے اپنی بیس (۲۰) سالہ عسکری خدمات سے حاصل کردہ عملی تجربات کی روشنی میں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب کا عنوان ہے: ''پاکستان۔ قومی سلامتی کے مسائل'' یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں الوقار پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب دراصل اُن کے اُن مضامین اور کالموں کا مجموعہ ہے جو گذشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں لکھے گئے اور مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان مضامین میں قومی دفاع کے متعلق اُن کے نظریات اور دفاعی مسائل اور معاملات پر ان کے مباحث سامنے آتے ہیں۔ ان مضامین کو لکھنے کا بنیادی مقصد ملک کے مختلف طبقوں کو دفاعی مسائل و معاملات کی مبادیات سے آگاہ کرنا تھا۔ کتاب کے ایک مضمون یا کالم ''قومی سلامتی کا تصور اور مسلح افواج کا کردار'' میں لکھتے ہیں:

''مسلح افواج اپنے فرائض کے لحاظ سے اور اپنی تنظیم و مقاصد کے پیشِ نظر ایک آلۂ کار ہیں۔ گو ان کی قوتِ محرکہ، کمان و انصرام کی تحرک پذیری، تعین و حصولِ مقصد کی صلاحیت اور یک رخی، یکجہتی تنظیم اُن میں قوتِ فیصلہ، اتحاد، بھروسہ اور بہت حد تک خود انحصاری کی صلاحیتیں پیدا کر دیتی ہے لیکن پھر بھی مسلح افواج بحیثیت تنظیم، قوم اور سلطنت سے جدا تخلیق و بصیرت، مقاصد و نظریات کی اہل نہیں ہیں۔۔۔ اُن کو قوم اور سلطنت سے باہر اور جدا کسی بھی نظریہ اور مقصد کے علمبردار یا محافظ کا کردار نہیں کرنا چاہیے۔ مسلح افواج اپنی تخلیق، تنظیم، نصب

العین ، تربیت اور مقاصد ۔ کسی بھی لحاظ سے اس کردار کی اہل نہیں ہیں ۔ یہ کردار بحیثیت مجموعی قوم کا ہے اور قوم کے اُن آئینی اداروں کا جنھیں قوم اس مقصد کے لیے تخلیق و تربیت دے۔'' (ص ۴)

اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان میں لگنے والے مارشلاؤں کا کوئی جواز نہیں بنتا بلکہ ان طالع آزما اور آئین شکن جرنیلوں کے آمرانہ ادوار میں ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔ میجر (ر) محمد خاں اشرف کا کہنا ہے:

''گزشتہ دور کے مارشل لاؤں نے قوم کے ذہن میں بہت سے الجھاؤ اور تفرقات چھوڑے ہیں جو کہ فوج کے گذشتہ سالوں کے عمل سے بہت الجھ چکے ہیں۔'' (ص ۸)

اس سے پہلے اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ ''ہماری بدقسمتی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلح افواج کو اب باقاعدہ سیاسی اہمیت اور سیاسی مقاصد رکھنے والے ایک ادارے کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا ہے۔'' (ص ۷)

اپنے ایک مضمون ''پاکستان کی دفاعی پالیسی کے بنیادی تصورات و مقاصد'' پر مثبت انداز میں بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ ''موجودہ جیوسٹریٹیجک حالات میں خود ہی اپنے دفاع کی ذمہ داری برداشت کرنا ہوگی اور اس کے لیے سب سے آسان، سہل اور مؤثر ترین طریقہ ایک مضبوط حکومت کا قیام، اندرونِ ملک قومی مفاہمت کا حصول اور عوام کو قومی دفاع کی سوچ اور عمل دونوں میں معاون و مددگار بنانا ہے۔'' (ص ۲۴)

اپنے ایک نہایت اہم مضمون بعنوان ''قومی سلامتی، آئین اور پاک فوج کا کردار'' میں مصنف نے فوج کے آئینی کردار پر بحث کرتے ہوئے مارشل لاؤں کی نفی کی ہے اور ملکی سلامتی میں مسلح افواج کی اہم ترین حیثیت کو قبول کرنے کے باوجود حکومت پر اُن کے قبضے کو رد کیا ہے اور مسلح افواج پر ادارہ جاتی کنٹرول کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ (ملاحظہ فرمایئے ص ۳۰۔۳۸)

اسی طرح ''پاکستان اور آزاد جمہوری معاشروں میں خفیہ اداروں کا کردار'' ایک نہایت اہم مضمون ہے جس میں ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے خفیہ اداروں کے کردار پر بحث کرتے ہوئے یہ مؤقف پیش کیا ہے کہ خفیہ اداروں کی خبر گیری اور معلومات کا ہدف چونکہ دوسرے ممالک ہوتے ہیں لہٰذا بنیادی طور پر ان اداروں کا اولین دائرۂ عمل ملک سے باہر ہوتا ہے اور یہی اُن کا بنیادی کام ہے (ص ۵۰) اور پاکستان میں بھی آئی ایس آئی کو انھی مقاصد کے لیے انھی خطوط پر استوار کیا گیا لیکن ملک میں غیر جمہوری حکومتوں کے ادوار میں یہ خبر بھی عام ہوئی کہ اس کو اندرونِ ملک سیاسی جاسوسی کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ گذشتہ پیپلز پارٹی کی حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی یہ اعلان کیا کہ آئی ایس آئی کا سیاسی سَیل ختم کر دیا گیا ہے اور اُس کو اب صرف پیشہ ورانہ مقصد کے لیے ہی استعمال کیا جائے گا یعنی کہ تزویراتی خبر گیری اور کاؤنٹر انٹیلی جنس کے لیے (ص ۵۱)۔ میجر (ر) محمد خاں اشرف کے خیال میں ایک جمہوری حکومت کا یہ اقدام صحیح سمت میں تھا لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ (ص ۵۱)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''یہاں یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ اندرونِ ملک سیاسی جاسوسی میں ان اداروں کا کوئی بھی کردار نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ نہ صرف آزاد جمہوری معاشرے اور حکومت کے تصور اور بنیادی انسانی حقوق کے منافی ہے بلکہ یہ ان اداروں کے اصل مقاصد سے بھی روگردانی

ہے۔'' (ص ۵۱)

اسی طرح ''کونسل برائے دفاع وقومی مسائل''، ''تحریکِ آزادیِ کشمیر''، ''دفاعی بجٹ سازی''، ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ''، آٹھویں ترمیم۔ جواز اور عدم جواز''، پاکستان کا ایٹمی دھماکہ''، ''کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے''۔ جیسے نہایت اہم قومی مسائل پر ڈاکٹر صاحب نے مدلل اور مثبت انداز میں گہری نظر ڈالی ہے اور اپنی آرا اور خیالات کو بلاکم وکاست پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذباتیت سے ماورا ہو کر مصنف نے بڑے معروضی اور عقلی انداز میں ان قومی مسائل پر بحث کی ہے۔ اُن کے نظریات اور خیالات سے جزوی اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اُن کے قومی جذبے اور ان کے خلوصِ نیت پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ وہ سوشل ڈیموکریسی کے طرفدار ہیں۔ جمہوری نظام پر یقین رکھتے ہیں اور حکومتی اور سیاسی مسائل میں کسی غیر جمہوری دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے اور تمام مسائل کے حل کا حق جمہوری انداز میں منتخب شدہ پارلیمنٹ کو دیتے ہیں۔

اُن کی عسکری نوعیت کی دوسری کتاب ''جرأت کے ستارے'' ہے جس کو انھوں نے قوم کے شہیدوں کے نام معنون کیا ہے جنھوں نے اپنا حال ہمارے مستقبل کے لیے قربان کر دیا۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ یہ کتاب دراصل ۸ بلوچ رجمنٹ کی داستانِ جنگ بھی ہے اور اس کے کارناموں کی تاریخ بھی۔ اگرچہ مصنف خود اس کتاب کو ۸ بلوچ رجمنٹ جیسی عظیم پلٹن کی شان وشوکت، میدانِ جنگ اور زمانۂ امن کی کامرانیوں کا صحیح اور مکمل احاطہ قرار نہیں دیتا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ اور مشرقی پاکستان ۱۹۷۱ء کی جنگ کے حقائق پر مبنی واقعات پر مشتمل ایک دلچسپ تاریخ ہے۔ مزید برآں اس کتاب کے ساتھ معلومات افزا، تاریخی نوعیت کے اعداد وشمار اور مستعمل ملٹری الفاظ واصطلاحات کی فرہنگ اور تشریح بصورت ضمیمہ جات منسلک ہے۔ میری ناقص رائے میں میجر (ر) ڈاکٹر محمد خاں اشرف کو عسکری تھنک ٹینک کا حصہ ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی علمی وادبی فتوحات کا دائرہ یہیں تک محدود نہیں ہے۔ اہلِ سیف بنے تو محیر العقول کارنامے انجام دے کر قابلِ فخر فوجی اعزازات حاصل کیے۔ اہلِ قلم بنے تو بے شمار مقالات، طبع زاد تصنیفات وتالیفات، مجموعہ ہائے اشعار تخلیق کر کے علم وعرفان اور شعر وادب کے سرمائے میں بے بہا اضافہ کیا۔ یونیورسٹیوں کے ساتھ وابستہ ہوئے تو ایم۔اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے طالب علموں کی رہنمائی اور تدریس کے علاوہ یونیورسٹیوں سے نکلنے والے علمی وادبی رسائل اور تحقیقی جرائد کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیے۔ بہترین یونیورسٹی ٹیچر کا اعزاز (۲۰۱۱ء) پانے کے ساتھ ساتھ تمغۂ ہجری اور تمغۂ صد سالہ (ولادت قائداعظم) بھی حاصل کیے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے دوران ملازمت میں ڈائریکٹر سہولیات، آفیسر انتظامیہ، انچارج سیکورٹی، ٹرانسپورٹ، سہولیات، چیئرمین ڈسپلن کمیٹی، سپرنٹنڈنٹ اقبال ہاسٹل (۱۹۹۷ء۔۲۰۱۱ء) رہ کر اپنی انتظامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کے مختلف درجوں کے لیے اردو اعلیٰ، لازمی اور اختیاری کے لیے نصابی کتابیں مرتب کر کے نام کمایا۔

روزنامہ ''جنگ'' میں ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۷ء تک باقاعدہ ہفتہ وار تزویراتی موضوعات پر کالم نگاری کر کے صحافت کے میدان میں بھی اپنا مقام بنایا۔ دیگر جامعات میں مکمل ہونے والے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالات کے خارجی ممتحن بھی ہوتے ہیں اور ان کے مختلف بورڈز اور اداروں کے ممبر بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ قلم اور اہلِ سیف کے دائرۂ علم و عمل میں جتنی جہات کے امکانات ہو سکتے ہیں میجر (ر) ڈاکٹر محمد خاں اشرف نے اس سب کو ایکسپلور (Explore) کرنے کی سعی کی ہے اور میری دانست کے مطابق اس سعی میں وہ پوری طرح کامیاب اور شاد کام رہے ہیں۔ ان کا یہ نہایت قیمتی عملی، علمی اور ادبی سرمایہ اور ورثہ آئندہ نسلوں کے لیے دلیلِ راہ بھی ثابت ہوگا اور نشانِ منزل بھی۔

☆......☆......☆